ترقی پسند دور کے ناول اور المیہ

مہناز خالد

Abstract:

Reading novel is a philosophical hobby. It triggers cognitive domains and imaginative powers. Characters play a vital role in this regard. Post Colonial Novels are filled with tragic characters. Tragedy is basiically a state of mind and the Psychology of a person can be well judged on the basis of tragedy. Tragic characters get our focus on the drawbacks of our society, and try to bring a positive change in it. Author is basically the reflection of society, so he critically analyse the societal, cultural and psychological aspects of the society. With the help of tragic characters, the novel writers bring in freshness, and excitement in the content, and resultantly, the tragic characters can be seen in various forms. societal changes have caused change in the trend of novels as well.Though tragic novels are not trending in the contemporary era, but as tragic characters are concern, they will remain always be part of novels in Literature.

ہندوستان کی سیاسی سماجی تحریکات اور بین الاقوامی حالات کے پس منظر میں (۱۹۳۶ء) میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا۔ اس تحریک کے خاطر خواہ اثرات اردو ناول پر بھی پڑے۔ یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ ہندوستان کی سیاسی اور معاشی آزادی کے سلسلے میں ترقی پسند تحریک کا اہم رول ہے۔ یہ سرسید احمد کی علی گڑھ تحریک کے بعد اردو ادب کی دوسری بڑی تحریک تھی۔ علی گڑھ تحریک نے ادب کی مقصدیت وافادیت پر زور دیتے ہوئے عقلیت پسندی کی جس روایت کی بنیاد ڈالی، ترقی پسند تحریک نے اس کو پروان چڑھایا۔ علی گڑھ تحریک جس زمانے کی پیداوار تھی وہ اصلاحی تحریکات کا زمانہ تھا۔ لیکن ترقی پسند تحریک خالص انقلابی تحریک تھی۔ ترقی پسند تحریک کا معاشرتی پس منظر بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اس دور میں ہندوستانی عوام میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کا جذبہ انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ ملک کی معاشی اور معاشرتی ابتری کے باعث غریب

مزدوروں، کسانوں اور نچلے طبقے کے لوگوں میں استحصال کا احساس، بغاوت اور جذبہ انقلاب بیدار ہو چکا تھا۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو ادب کے سرمائے میں بیش بہا اضافے ہوئے۔ ادب کو زندگی کے دیگر شعبوں اور مختلف علوم وفنون مثلاً سیاست، سماجیات، اخلاقیات، نفسیات اور تاریخ سے قریب تر کیا۔ ادب اور ادیب کو انفرادی تناظر میں دیکھنے اور پرکھنے کی طرح ڈالی گئی۔ اس نقطہ نظر کی بدولت نئی اور انقلابی اقدار کو رواج ملا۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر تخلیق کئے گئے ناولوں میں غلامی کا کرب، آزادی کی خواہش، جدوجہد آزادی، طبقاتی کشمکش، جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی درندگی، غربت، افلاس، بے روزگاری، غریب مزدور کسان طبقے کا استحصال، سماجی اور معاشی انتشار اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والی بے اطمینانی، پریشانی، محرومی، جنسی گھٹن، اعلیٰ طبقے کی اخلاقی اقدار اور معاشرتی زندگی کا انحطاط، مذہبی جبر واستحصال، داخلی کشمکش، سماجی بدعنوانیاں، دیہی وشہری زندگی کے مسائل اور اسی نوع کے بے شمار موضوعات کو ناول میں جگہ ملی۔ ڈاکٹر قمر رئیس ناول اور ترقی پسند تحریک کے حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:

> ''اس میں شک نہیں کہ اردو ناول مجموعی طور پر ترقی پسند نظریہ ادب اور زندگی کے قریب رہا ہے۔ بدلتی ہوئی زندگی کے رشتوں اور ہیبت پر غور فکر اور اس کی معنویت کی تلاش کا جذبہ ہر دور میں نمایاں رہا ہے۔''[۱]

ترقی پسند ناول نگاروں نے اپنی توجہ معاشرے کے داخلی مسائل کی طرف کی۔ پریم چند سے پہلے کے ناول کے کچھ مخصوص رجحانات تھے۔ اس دور کے ناول تو مسلمانوں کے شاندار ماضی کو یاد کرتے ہیں یا پھر متصادم وابستگیوں کے درمیان باہم دگر ہیں۔ جہاں ناسٹیلجیا ہے وہیں شاندار ماضی کی بازیافت اور تعمیر نو کا جذبہ بھی سرگرم عمل ہے۔ الجھنوں کی وجہ سے کہیں کہیں یاسیت بھی در آتی ہے۔ لیکن پہلی جنگ آزادی کے بعد صنعت کاری کے فروغ نے باہر کی دنیا سے بڑھتے ہوئے روابط، روسی انقلاب، ٹریڈ یونین تحریک نے نئی حیثیت کو جنم دیا، اور ایسی فضا تیار کی جس میں سچی حقیقت نگاری کی جانب تیز رو پیش قدمی ممکن ہو سکی۔ ترقی پسند تحریک کے حوالے سے مختصر جائزہ لینے کے بعد ہم اس دور کے ترقی پسند ناول نگار اور ان کے المیہ کرداروں کا تفصیلا جائزہ لیتے ہیں۔

قاضی عبدالغفار کی تصنیف 'لیلیٰ کے خطوط' ۱۹۳۲ء میں وجود میں آئی۔ اس کتاب میں ایک طوائف کے کردار کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ رومانوی دور کے رویوں اور عورت کے بارے میں اس زمانے کے نظریات اور طرزِ احساس کو جاننے کے لئے یہ کتاب ایک اہم دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔ اس ناول کے بارے میں یہ بحث ابتدا سے ہی چلی آ رہی ہے کہ اس کو ناول کہا جائے یا افسانہ؟ اس مشکل کا حل خود مصنف نے کتاب کے دیباچہ میں دے دیا ہے کہ ان صفحات کو اگر ناول یا افسانہ سمجھ کر پڑھا جائے تو یہ مجھ پر ظلم ہوگا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ کتاب ناول یا افسانہ نہیں، بلکہ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ اسے محض قصہ کہانی کے طور پر نہ پڑھا جائے۔ بلکہ اس کے کرداروں کا

جائزہ لیا جائے اور اس کا نفسیاتی مطالعہ کیا جائے۔ اصل میں یہ کتاب ایک عاشق کے لکھے ہوئے خطوط کا جواب ہے۔ جس میں طوائف کی گھناونی زندگی سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ اور انہیں اس منزل تک پہنچانے والوں کو بے نقاب کیا گیا ہے کہ یہ مسجد کے محراب و منبر پر بیٹھنے والوں کے کام ہیں جو اپنی تسبیح کے دانے گھمانے میں مست ہیں، انہیں معاشرے کا ناسور سمجھتے ہیں۔ لیکن اصل میں وہ خود اس ناسور کو پیدا کرنے والے ہیں۔ بقول قاضی عبدالغفار:

> ''ان خطوط کی یکجا اشاعت سے مقصود صرف یہ ہے کہ جو لوگ لیلیٰ کے مخاطبِ اصلی ہیں، ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے ایک قطرہ خون نکال کر خوردبین کے سامنے رکھ دیا جائے تا کہ اس ایک قطرے سے ان تمام جراثیم کا پتہ چل جائے جو ہمارے نظام زندگی کو گھن لگا رہے ہیں۔ لیلیٰ درحقیقت ہمارے جلسہ اجتماعی کا صرف ایک قطرہ خون ہے جو میں ان بزرگان ملت کی خدمت میں لایا ہو جن کا فرض تھا کہ مصلوں پر تسبیح لے کر بیٹھنے اور منبروں پر بے معنی اور بے نتیجہ وعظ فرمانے کی بجائے اپنی تہذیب کے اس ناسور کے لئے جس کا ایک قطرہ خون لیلیٰ ہے کوئی مرہم تجویز کریں۔ اور اپنی لیڈری کے پلیٹ فارم پر محض تقریریں کر کے اپنے مجرم ضمیر کو تسکین دینے کی کوشش نہ کریں۔''[۲]

قاضی عبدالغفار نے اس کتاب میں ایک طوائف کی داستان بیان کی ہے۔ اس کی زبانی اس کی زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا ہے۔ اس کی گفتگو سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ طوائف ہو کر بھی وہ ایک عورت ہے۔ اس قدر زخم خوردہ ہو کر بھی وہ انسانیت کا پیکر ہے۔ قاضی عبدالغفار نے لیلیٰ کے کردار کے ذریعے طوائف کی زندگی کو نفرت انگیز بنانے کی بجائے دردانگیز بنا دیا ہے۔ لیلیٰ کے کردار میں مظلوم کی آواز سنائی دیتی ہے۔ لیلیٰ ایک ایسی عورت ہے جس کے ساتھ معاشرہ انصاف نہ کر سکا۔ اس کردار کے ذریعے بازاری عورت کے کردار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ وہ عاشق کے خطوط کا مضحکہ اڑاتی ہے۔ اور اس کے عشق کو ایک وبال سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتی۔ وہ اگر عاشق کا مذاق اڑاتی ہے تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں کیونکہ وہ ایک مصیبت کی ماری لڑکی ہے۔ جو بیس بائیس سال میں ہی خود کو بوڑھا محسوس کرنے لگتی ہے۔ وہ ایک شریف گھرانے کی لڑکی تھی اور اپنے محبوب کو اپنا سچا ساتھی سمجھتی تھی اور اپنے محبوب کا ساتھ دینے کے لئے گھر سے بھاگ نکلتی ہے۔ لیکن اس کا محبوب اس کو دھوکا دیتا ہے۔ اور آخر کار وہ اس بازار میں پہنچ جاتی ہے۔ لیلیٰ دراصل زندگی کو ایک بوجھ سمجھتی ہے۔ اور ہر دن گزرنے کے ساتھ اس کی خواہشات اور امنگوں کا گلا گھونٹا جا رہا ہے۔ لیلیٰ کا کردار زخم خوردہ ہو کر ایک فلسفی کا روپ اختیار کر لیتا ہے اور اس کی نظر زندگی کی دکھتی رگوں پر ہے۔ لیلیٰ ان دکھتی رگوں کو بلا جھجک چھیڑتی ہے۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ مرد ہی عورت کو نیک یا پارسا بناتا ہے۔ اور اس کو بازار کی زینت بھی مرد ہی بناتا ہے۔ وہ بازار میں بیٹھی عورت کے پاس آتا ہے۔ اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ دو پیسے اس کی جھولی میں ڈالتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ اس بازار میں بیٹھنے والی کی کیا خواہشات ہیں، کیا

تمنائیں ہیں، اگر وہ اس پر احتجاج کرتی ہے تو اس پر چیختا چلاتا ہے۔

''ایک نادان تیماردار کی طرح جو نہیں جانتا کہ مجروح کے جسم پر چادر سے ڈھکے ہوئے کتنے زخم ہیں اور کہانیاں ہیں۔ اور نادانستہ جہاں چاہتا ہے ہاتھ لگا دیتا ہے۔ جب اس تکلیف سے مریض چیختا ہے تو وہ حیران ہوتا ہے کہ وہ کیوں چیخا۔''[۳]

اس احتجاج سے وہ ہمدردی کرتا ہے اور اپنا مطلب پورا کرنے کے بعد چلا جاتا ہے۔ مرد چاہتا ہے کہ عورت ہمیشہ اس کی محتاج رہے، روپے اور نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے۔ مرد عورت کو غلامی پر مجبور کرتا ہے۔ اس کے عشووں سے، اس کے ناز و نخرے سے محظوظ ہونا چاہتا ہے۔ جب کوئی خوبصورت عورت دیکھتا ہے تو اس کا نفس کہتا ہے یہ تیرا شکار ہے۔ وہ عورت سے عشق کا اظہار کرتا ہے۔ بڑے شیریں اور خوب صورت لباس میں عورت جو فطرتاً خوبصورت ہے، معصوم ہے، مرد مکار کے عشق کے مطلب کو نہیں سمجھتی اور جال میں پھنس جاتی ہے۔ ناول میں ایک جگہ درج ہے: ''مرد نے اپنے نفس کی خواہشوں کا نام عشق رکھا ہے۔''[۴] لیلیٰ نے ایسے لوگوں کا بھی راز فاش کیا ہے جو مسند پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ زنان بازاری سے عام حالات میں سلام لینے کو پسند نہیں کرتے۔ ان کو فاحشہ کہتے ہیں۔ یہی لوگ ان فاحشوں کے قدموں میں آ کر سر جھکا دیتے ہیں۔ لیلی نے مذہب اور شریعت کی آڑ میں عیاشی کے پردے کو بھی چاک کیا ہے۔ تعداد ازدواج کو شریعت کے پردے میں عیاشی اور نفس پرستی کا بہانہ بنایا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک عورت مرد کے نفسانی قوی کو مکمل نہیں کر سکتی لہٰذا مرد چار شادیوں کا ڈھونگ رچاتا ہے۔ لیلیٰ کہتی ہے کہ میں ایک عورت ہوں اور پورے اعتماد سے کہتی ہوں کہ ایک عورت ایک مرد کے لیے کافی سے زیادہ ہے۔ وہ کہتی ہے کہ ازدواج کی کثرت نفس کی قوت نہیں بلکہ دماغ کی بیماری ہے۔

قاضی عبدالغفار نے لیلیٰ کے کردار کے ذریعے عصمت فروش عورت کے شب و روز پر ہی نہیں بلکہ پوری معاشرت پر تنقید کی ہے۔ اس کے ذریعے ہندوستانی زندگی اور معاشرت کے بہت سے پہلوؤں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ لیلیٰ کے کردار کا مطالعہ کر کے اس کردار سے ہمدردی ہوتی ہے کہ طوائف جس کے بدن سے مرد رات بھر کھیلتا ہے اور صبح ہوتے ہی چلا جاتا ہے۔ اس کی روح کی گہرائیوں میں نہیں جھانکتا جہاں اس کی نسوانیت دکھی پڑی ہے۔ وہ عورت پہلے اور بیسوا بعد میں ہوتی ہے۔ اسے زندگی کے کسی موڑ پر بھی اپنایا جا سکتا ہے۔ وہ بھی اپنے خوشگوار مستقبل کی خواہشمند ہوتی ہے لیکن ہمارا معاشرہ اس کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے دل میں اپنے گھر کی آرزو رکھے۔

قاضی عبدالغفار کی اس کتاب کی اہمیت اس لیے بھی بہت زیادہ ہے کہ اس میں طوائف کے کردار کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ رومانوی دور کے رویوں اور عورت کے بارے میں اس زمانے کے نظریات اور طرز احساس کو جاننے کے لیے یہ کتاب اہم دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔ لیلی اردو افسانوی ادب کا اہم کردار ہے کیونکہ اس کردار میں ایک خاص طبقے کی نفسیات پوری طرح آشکار ملتی ہے۔ اس کردار کی تخلیق مجبوریوں اور سماجی حالات کی وجہ سے ہوتی ہے۔

یہی حالات لیلی کے کردار میں بے چارگی اور بغاوت کا جذبہ بھر دیتے ہیں۔

رشید اختر ندوی کا تیسرا ناول ''سودائی'' پہلی دفعہ ۱۹۴۳ء میں طبع ہوا۔ اس سے پہلے مصنف کے دو ناول ''ساز شکستہ'' اور ''سوزِ دروں'' چھپ چکے تھے۔ رشید اختر ندوی کا یہ ناول رومانوی ٹریجڈی ہے۔ اس ناول میں نوجوان لڑکے نعیم پر کئی نوخیز لڑکیاں بیک وقت عاشق ہو جاتی ہیں لیکن کامرانی کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔ ناول کا ہیرو متوسط طبقے کا نوجوان ہے اور اسکی چاہنے والیاں اعلی طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ناول کا ہیرو ہر وقت لڑکیوں میں گھرا رہتا ہے۔ اور اگر وہ کسی ایک طرف مائل بھی ہوتا ہے تو دل کسی کا نہیں توڑتا۔ آخر میں حالات یہ ہو جاتے ہیں کہ ہیرو کی محبوبہ کسی اور پر عاشق ہو جاتی ہے اور ہیرو اس بیوفائی پر ذہنی ہیجان کا شکار ہو جاتا ہے اور آخر کار راہ فرار اختیار کرتا ہے۔ پاگل ہو جاتا ہے۔ ناول میں نعیم نامی کردار سولہ سال کا نوجوان ہے۔ اس کی عمر اتنی بڑی نہ تھی کہ وہ عورت کے جذبات و احساسات کو جان سکتا۔ محبت کی ابتدا عام طور پر لڑکوں کی طرف سے ہوتی ہے لیکن جو لڑکے چھوٹی عمر کے اور شرمیلے ہوں اور ان کا واسطہ بڑی عمر کی شریر لڑکیوں سے پڑ جائے تو وہ آغاز کیا نباہ بھی نہیں کر سکتے۔

نعیم ایک نیک اور پارسا گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ احساسات محبت سے متاثر تو ہو سکتا تھا لیکن اس کی رو میں بہہ کر پھسل نہیں سکتا۔ نعیم کی عمر بھی اتنی نہ تھی کہ وہ اس جذبہ کو محسوس کر سکے جو عورت اور مرد کے جسموں کے اتصال سے نمودار ہوتا ہے اور لذت پاتا ہے جبکہ رشیدہ جو اس سے محبت کا دم بھرتی ہے اسکی سوچ اور جذبات اس کے برعکس تھے۔ وہ نعیم سے دلی محبت کرتی تھی اور جسمانی طور پر بھی نعیم سے اس کا اظہار چاہتی تھی۔ نعیم سے اکثر وہ چھیڑ چھاڑ کرتی اور اسکے جذبات و احساسات کو ہوا دیتی۔ لیکن نعیم اسکی ان باتوں کو نہ سمجھ پاتا۔

''رشیدہ نے ایک بار نہیں تین چار بار اسکی آنکھیں چومیں اور ایک بار تو اسکے ہونٹوں پر چٹکی بھی لی لیکن نعیم بت بنا بیٹھا رہا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ محبت میں اس سے آگے بھی کوئی منزل ہے۔''[۵]

نعیم کی کامیابی کے بعد نعیم کے سکول کے ہیڈ ماسٹر اس کو اپنے ساتھ دہلی لے گئے جہاں نعیم نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ نعیم رشیدہ سے دور چلا گیا۔ گو کالج میں نعیم کا واسطہ کئی لڑکیوں سے پڑا جن میں حسینہ بانو، پرتما، شوشیلا اور رخسار شامل تھیں۔ سب نعیم سے بہت محبت کرتیں لیکن نعیم ہمیشہ رشیدہ کی یاد میں ڈوبا رہتا۔ کالج کی چھٹیوں میں جب وہ گھر آتا ہے تو اسکو علم ہوتا ہے کہ رشیدہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ نعیم کو اس بے وفائی سے بہت دکھ ہوتا ہے۔ اسکے دل سے صدمے کو برداشت یا نہ برداشت کرنے کی صلاحیت ہی چھن جاتی ہے اور وہ اپنے حواس کھو بیٹھتا ہے۔ اس کردار کا المیہ اسکی سادگی، معصومیت اور لڑکپن ہے۔ رشیدہ بداخلاق اور برے ماحول کی پروردہ ہے جو محبت تو کرتی ہے مگر جسمانی لذت بھی حاصل کرنا چاہتی ہے۔ رشید اختر ندوی رومانوی ٹریجڈی لکھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں سہیل بخاری لکھتے ہیں:

''ان کا ہیرو متوسط طبقے کا نوجوان ہوتا ہے اور ہیروئن یا دوسری چاہنے والیاں اعلی طبقے سے تعلق

رکھتی ہیں ہیرو راجہ اندر کا ہم قسمت ہوتا ہے۔ جسے ہر وقت متعدد پریاں گھیرے رہتی ہیں اور اگر وہ مائل بھی ہوتا ہے تو کسی ایک کی جانب۔ اب حالات کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ یا تو اسکی محبوبہ کسی دوسرے پر عاشق ہوتی ہے یا اگر وہ اسکو چاہتی ہے تو اسکی بن نہیں پاتی۔ ہیرو مجہول ہوتا ہے اور خود حالات پر قابو پانے اور بندھن توڑنے کی جرات نہیں رکھتا۔ لہذا آخر میں راہ فرار اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ یا تو پاگل ہو جاتا ہے یا پھر غم غلط کرنے کے لیے مے نوشی شروع کر دیتا ہے اور ٹریجڈی مکمل ہو جاتی ہے۔''[۶]

''سازِ شکستہ'' رشید اختر ندوی کا ایک اور کامیاب ناول ہے۔ سازِ شکستہ کی کہانی کا آغاز ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے ساتھ برصغیر کے بدلتے ہوئے سیاسی و سماجی حالات کے پس منظر میں ہوتا ہے۔ ناول کا ہیرو سلیم نامی نوجوان ہے۔ ناول کی کہانی کا تعلق اس عہد سے ہے جب انگریز برصغیر میں اپنے پنجے گاڑ چکا ہوتا ہے۔ دنیا کے چند بڑے آپس میں الجھتے ہیں اور نتیجے میں پہلی جنگ عظیم کا جہنم جل اٹھتا ہے اور انگریز نو آبادیت سے تعلق رکھنے والے کروڑوں غلام اس آگ کا ایندھن بنا دیے جاتے ہیں۔ ۱۹۱۵ء میں سلیم میٹرک کے بعد علی گڑھ میں داخل ہوتا ہے۔ وہ مولانا محمد علی جوہر سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ دہلی میں ایک باغیانہ تقریر کرنے پر اسے جیل بھی جانا پڑتا ہے۔ بعد میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان روانہ ہو جاتا ہے۔ سلیم کا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنے کردار کی پاکیزگی کی خاطر اپنے کیریئر، اپنی تعلیم اور دنیاوی عیش و آرام کی قربانی دیتا ہے۔ انگلستان کی رنگینیوں کو ٹھکرا کر جیل کی ویرانیوں کو ترجیح دیتا ہے۔ دیار غیر میں تین برس کی جیل کاٹ کر وہ وطن کی سرزمین پر واپس قدم رکھتا ہے تو شاداں نہیں بلکہ شکستہ، ملول، اداس، پژمردہ اور تھکا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ خود کہتا ہے کہ لوگ وطن تعلیمی اعزاز کے ساتھ واپس آتے ہیں لیکن میں چوری کا الزام ساتھ لایا۔ حقیقت یہ ہے کہ چوری کا یہ الزام سلیم کے لاشعور کا حصہ بن جاتا ہے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کسی احساس ندامت کا شکار رہتا ہے جسکا اظہار بعد میں کئی موقعوں پر کرتا ہے۔ وطن واپسی پر سلیم کے پاس کوئی کام نہیں ہے چنانچہ وہ اپنے دوست نوابزادہ محمود سرور کے لیے مضمون اور کتابیں لکھنا شروع کر دیتا ہے۔ ایک روز سلیم اپنی تحریر نوابزادہ کو سناتا ہے۔ نواب صاحب نے خوشی سے اسکا ہاتھ چوما اور کہنے لگے، جی چاہتا ہے تمہارے ہاتھ چوم لوں۔ سلیم بولا: '' مگر ہاتھ سے کیا ہوگا، کوئی دماغ کو کیسے چرائے گا؟'' نوابزادہ نے ہنستے ہوئے کہا: ''دماغ تو میں چرا چکا ہوں۔''[۷] خوب سلیم یہی (sense of guilty) ایک بھوت کی طرح ہر جگہ سلیم کا تعاقب کرتی ہے۔ ایک ناکردہ گناہ کی سزا اس کی نفسیات کا حصہ بن جاتی ہے۔ چور چور کا یہ احساس زندگی بھر دامن گیر لیتا ہے اور کردار کے اندر شکست خوردگی کی بے رنگی نظر آتی ہے۔ مگر ان سب کے باوجود اس ناکام اور بیمار شخص کے باطن میں دنیاوی ترغیبات کو اعلیٰ کردار کے آگے نیچ اور نیچ سمجھنے والی ایک شخصیت صاف نظر آتی ہے۔ عبدالحمید سالک لکھتے ہیں:

''مگر اس نے بہت کچھ کیا یہی جن ذہنی تحفظات کی حدود میں وہ مقید ہے ان حدود کو وہ درست مانتا

ہے، یہ اخلاقی قدریں کو بظاہر اس کی زندگی میں خوشحالی اور ذہنی سکون کو کوئی دروازہ کھولنے کے بجائے تنگدستی کی ذلتوں اور بیماری کی کلفتوں کے سوا کچھ نہیں دیتیں وہ ان کا قاتل ہے، اور انہیں درست مانتا ہے۔''[۸]

سلیم میں اعلیٰ اقتدار کے باوجود ہمت ناپید ہے۔ سلیم کی بے علمی، بزدلی اس کی تمام تر محبت، شرافت اور شعور کے باوجود اسے ہمیشہ کیلئے اس کی محبت سے محروم کر دیتی ہے۔ دراصل لندن کا حادثہ اس کو نفسیاتی طور پر مریض بنا دیتا ہے۔ نفسیاتی طور پر وہ غیر تکمیلی شخصیاتی خلل کے عارضے میں مبتلا ہے، اس عارضے میں مبتلا افراد اپنے آپ کو نامکمل تصور کرتا ہے، اور اس بنا پر پیدا شدہ احساس کا سدباب کرنے میں مصروف نظر آتا ہے، ایسا فرد ضرورت سے زیادہ محتاط رویوں کا اظہار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی سلمٰی نامی محبوبہ سے محبت تو کرتا ہے لیکن اس کے بھائی سے سلمٰی کا رشتہ نہیں مانگ سکتا ہے۔ وہ ضرورت سے زیادہ محتاط ہے سلمٰی کے بھائی کے لئے تقاریر تو لکھتا ہے لیکن اس کے بھائی کو محبت کے بارے میں بتانے سے محتاط ہے۔ اس کے ساتھ وہ ذہنی (frustration) کا بھی شکار ہے اور راہ فرار کی کوشش میں ہے۔ سجاد ظہیر کا ناول ''لندن کی ایک رات'' ۱۹۳۸ء میں چھپا بعض ناقدین نے اس کو ناول ماننے سے انکار کیا اور بعض نے اس کو ناولٹ کہا۔ بہر حال یہ ناول ہندوستانیوں اور انگریزوں کے ذہنی انتشار اور جذباتی کشمکش کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ ناول دراصل لندن کی معمول کی زندگی کی ایک رات پر محیط ہے۔ اس لئے اس ناول میں موجود کرداروں کے انجام کے بجائے ان کا تعارف اور بیتی ہوئی زندگی کی تفصیل ملتی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار نعیم ایک لاپرواہ اور بے فکر انسان ہے اس کہانی میں، سجاد ظہیر نے ہندوستان اور اس کے باہر یورپی ذہین اور ماحول وہاں کی تہذیبی، اخلاقی پستی اور مختلف الجھنوں کی مصوری کی ہے۔ اس ناول کے تمام کردار اپنی خاص فکری ساخت کے باوجود ایک طرح کی ژولیدگی کا شکار ہیں۔ یہ ژولیدگی دراصل اس داخلی جذباتی کشمکش کا نتیجہ تھی جو پہلی جنگ عظیم کے درمیانے طبقے کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ذہن میں گھر کر چکی تھی۔ ڈاکٹر سید علی حیدر ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''''لندن کی ایک رات' میں اس ناآسودگی کا احساس ملتا ہے۔ جو نوجوانوں کے دلوں میں پرورش پا رہی تھی۔ اس ناول میں مختلف رجحانات رکھنے والے نوجوانوں کی نفسیاتی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ناول اپنے دور کے ہندوستان کے سیاسی و سماجی حالات کا عکاس ہے۔ اور ہندوستانی زندگی کے مختلف رجحانات، اہم مسائل اور نوجوان ذہین کے جذبات و نفسیات کا ترجمان ہے۔ 'لندن کی ایک رات' کے کردار ہندوستان کے زمیندار اور نوکر شاہی طبقے کے مختلف رجحانات، ذہنی کشمش سوچنے کے انداز اور نظریہ حیات کی نمائندگی کرتے ہیں۔''[۹]

نصیر احمد خان لکھتے ہیں:

> ''''لندن کی ایک رات' میں محض ایک رات کا بیان ہے جس میں مختلف کرداروں کی داخلی اور

خارجی زندگی کو مختصراً پیش کیا گیا ہے۔ لیکن جو چیز جہاں اہم ہے وہ یہ ہے کہ سات سمندر پار تعلیم کی غرض سے گئے ہوئے ہندوستانی نوجوان کس طرح کی زندگی گزار رہے تھے۔ اپنے عہد کے مسائل سے وہ کس طرح جڑے ہوئے تھے؟ ان کے ذہنی اور جذباتی تجربے کیا تھے انہی سوالوں کے گرد پورا ناولٹ گھومتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ناولٹ میں اپنے عہد کے تمام بنیادی مسائل کی طرف بلیغ اشارے موجود ہیں جو ہندوستانی نوجوانوں کی حیثیت اور ان کی عصری آگہی سے ہمیں واقف کراتے ہیں۔ سجاد ظہیر نے پہلی بار اس ناول میں شعور کی رو کی تکنیک استعمال کی، اس میں داخلی شعور کی تصویر کشی اور تلازمہ خیال کے نمونے کرداروں کے ذریعے پیش کئے گئے ہیں۔ ناول میں اس وقت کا ہندوستان پیش کیا گیا ہے جو ذہنی مسائل اور مشکلات سے دوچار ہے، نوجوانوں کا ذہنی، انقلابی رجحان اور تشدد کی طرف مائل ہوتا نظر آتا ہے۔''[۱۰]

راؤ کا کردار کرتب، نفرت، طنز تلخی اور تحریک آزادی میں ٹھنڈی سیاست کی خلاف غم وغصہ کے ملے جلے تاثرات کو پیش کرتا ہے۔ راؤ بیرسٹر بننے کیلئے لندن آتا ہے وہ سیاست، میں گہری دلچسپی رکھتا ہے۔ اپنی سرزمین کو مقدس جانتا ہے، انگریزی غلامی کے سخت خلاف ہے۔

راؤ اشترا کی رجحانات کا مالک ہے، لیکن بنیادی طور پر اس کا کردار تشکیک پسند ہے۔ راؤ ہندوستان سے محبت کرتا ہے ہندوستان میں معمولی سے معمولی انگریز کا مقام ومرتبہ بڑے بڑے ہندوستانی سے بلند ہونے پر بڑھتا ہے۔ اس کے جذبات اور احساسات مضطرب ہوتے ہیں۔ وہ عالمی جنگ عظیم کے اثرات اور جدید سائنسی نظریات کا قائل ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے ملک سے محبت کرتا ہے۔ وہ اپنے ملک ہندوستان کے المیے کی جیتی جاگتی تصویر یوں بیان کرتا ہے:

''ہندوستانیوں کی ایک بھیڑ نظر آتی ہے، جس میں زیادہ تر غریب میلے کچلے کپڑے پہنے ہوئے لوگ تھے، جن کے چہروں پر دھوپ، ہوا اور بھوک کے اثر سے جھریاں اور گھڑھے پڑے ہوئے تھے جن کے ہاتھ مزدوری کرنے سے سخت اور مضبوط ہو گئے تھے۔ جن کی آنکھوں میں محنت کی روشنی تھی، جن کے کندھے جھکے ہوئے تھے جن کی ٹانگیں ان کی میلی دھوتیوں سے لکڑی کی طرح نکلی ہوئی تھیں۔''[۱۱]

یہ ہندوستانی عوام کی غلامانہ زندگی کا بڑا کرب ناک نقشہ ہے جس میں انسانیت بے بس اور پسی ہوئی نظر آتی ہے۔ بھوک اور افلاس عوام کا مقدر بن چکی ہے۔ جس کی وجہ سے بے بس اور مجبور لوگ مایوس چہروں کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ ''لندن کی ایک رات'' میں تمام کردار اپنے اپنے افکار ونظریات ہی کا اظہار نہیں کرتے بلکہ اپنے دور کے

ہندوستانی نوجوانوں کی پوری نمائندگی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

ناول میں کریمہ بیگم کا کردار بھی ایک ایسا اہم کردار ہے۔ کریمہ کا کردار بنیادی طور پر ہندوستانی عورت کا کردار ہے وہ اپنے اندر حسد اور جلن جیسی صفات رکھتی ہے۔ اس کے باوجود اپنی روایات کو نہیں چھوڑتی، ہندوستانی عورت کا زیور یعنی حیا کو پامال نہیں ہونے دیتی۔ ناول میں سماجی اور نفسیاتی حوالے سے مغربی معاشرے کے خدوخال ملتے ہیں۔ کریمہ بیگم کی زبان سے دراصل سجاد ظہیر نے ہمارے نوجوانوں کا المیہ پیش کیا کہ یورپی معاشرت کا انتشار وہاں پر مقیم ہندوستانی نوجوانوں کو بے راہ روی کی طرف لگا رہے ہیں اور ایک ایسے معاشرے کی تہذیبی خدوخال پیش کئے ہیں۔ جہاں عورت ہر برے فعل کو اپنائے ہوئے ہے اور عیاشی اس کی زندگی کا بنیادی مقصد ہے شرم وحیا عصمت اور آبرو مغربی خواتین کے نزدیک ایک فرسودہ چیز ہے..... کے بارے میں کریمہ بیگم یوں کہتی ہے:

> ''نہ معلوم چینی کتنے ہندوستانیوں کو خراب کر چکی ہے، چلتر باز لیکن آخر ان لڑکوں (ہندوستانیوں) کے عقل پر کیوں پردے پڑ چکے ہیں۔ وہ بہت پڑھی لکھی بھی تو نہیں، سینہ سپاٹ، پھیکا رنگ صورت پر پھٹکار برستی ہے، جسم مردوں جیسا پر عورت ہے یا پہلوان، ایسی کئی لڑکیوں کو تو یہاں شوہر دستیاب نہیں ہوئے سب جوتیاں چٹخاتی پھرتی ہیں۔''[۱۲]

کریمہ کا ہر لفظ دراصل اپنے معاشرے کا عکس ہے جہاں ایک طرف نوجوان طبقہ اپنی اقدار سے دوچار ہے وہاں مغربی معاشرت کو تیزی سے اپنا رہے ہیں۔

سجاد ظہیر کے ناول کے کردار نظریاتی طور پر ان ذہنی رویوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس میں پہلی دفعہ ہندوستانی طلبا کی سوچ اور اندرونی و بیرونی کشمش کا اظہار بڑی مہارت سے ملتا ہے۔ مشتاق احمد دورانی 'لندن کی ایک رات' کا یوں تجزیہ کرتے ہیں:

> ''بحیثیت مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سجاد ظہیر کا یہ ناولٹ اپنے اندر درجہ بہ درجہ جذباتی اور نفسیاتی زندگی کی الجھنوں کو ظاہر کرتے ہوئے ہندوستانی اور یورپ کے سیاسی، سماجی، ثقافتی اور اخلاقی حالات کی ژولیدگی اور انتشار کو پیش کرتا ہے اور زندگی کے یہ مختلف پہلو صرف سوا ایک سو صفحات میں سمیٹے گئے ہیں۔ سجاد ظہیر کا یہ ادبی کارنامہ شاید بغیر شعور کی رو کی تکنیک کے پایہ تکمیل تک نہ پہنچا۔''[۱۳]

عصمت چغتائی کا ناول 'ضدی' (۱۹۴۱ء) میں تحریر ہوا۔ 'ضدی' کا موضوع طبقاتی کشمش ہے۔ 'ضدی' ناول ایک ایسا ناول ہے جس نے ان کو ایسے فنکاروں کی صف میں لا کھڑا کیا جو سماجی مسائل سے دلچسپی رکھتا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام سے آزادی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ 'ضدی' کے دو مرکزی کردار ہیں۔ پورن اور آشا پورن ایک زمیندار گھرانے کا چشم و چراغ ہے وہ زیادہ وقت شوخی میں گزارتا ہے۔ اس کے ساتھ ضدی اور عاشق مزاج بھی ہے۔ کہانی

جس میں پورن اور آشا کی پریم کہانی ملتی ہے۔ اور پورن ظالم سماج کے قانون اور رسمیں ماننے سے انکار کرتا ہے۔ آشا کی جدائی پورن کو شدید علیل کر دیتی ہے۔ پورن ایسا کردار ہے جو مروجہ طبقاتی نظام محبت کی آزادی سے محروم رہ کر ضدی بن جاتا ہے۔ بقول علی عباس حسینی: ''خاندانی بندشوں کے خلاف رائے بغاوت نہ پا کر گھلتا ہے اور مر جاتا ہے۔''[۱۴]

پورن شائستہ سماج کی تعمیر نو کی ترغیب ہے وہ مر کے ہمدردی کا مرتکب بنتا ہے۔ پورن سماج کے ناروا رویے کی وجہ سے نفسیاتی مریض بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیوی مل جانے پر بھی وہ اس کو پیار نہیں دے پاتا۔ ڈاکٹر عبدالسلام پورن کے اس رویے کے بارے میں لکھتے ہیں: ''جس نے کیتھی کی محبت میں ناکامی کا انتقام اپنے رقیب کے خاندان سے لیا۔ اسی قسم کا بدلہ پورن نے اپنے گھر والوں سے لیا۔''[۱۵]

آشا غریب طبقے کی سادہ اور معصوم لڑکی ہے۔ پورن اس سے محبت کرتا ہے لیکن وہ اس محبت کو پورن کا ابالی پن اور شوخی سمجھتی ہے۔ لیکن جب پورن اپنی محبت کا یقین دلاتا ہے تو آشا جواب دیتی ہے:

''کیا مل جائے گا آپ کو ایک.....کنگالی کا ٹھٹھہ اڑا کر، آپ کا میرا جوڑ نہیں آپ کے لیے تو کوئی رانی چاہیے۔''[۱۶]

آشا کے کردار میں نفسیاتی ژوف بینی کے جلوؤں کے ساتھ حقیقت نگاری بھی نظر آتی ہے آشا مکمل المیہ کردار ہے۔ معاشرہ غریب اور نیچ ذات کی لڑکی کا استعمال کرتا ہے۔ آخر کار اس کا انجام موت پر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر خالد اشرف یوں رقم طراز ہیں: ''عصمت نے اپنے ناول ''ضدی'' میں جن کرداروں کو پیش کیا ہے۔ ان سب نے نفسیاتی ردعمل کے سبب سماج کی ان خرابیوں کو جو روزمرہ کیا نسانی زندگی کو درپیش ہوتی ہیں حق ادا کر دیا ہے۔''[۱۷]

آشا کے کردار میں نفسیاتی ژوف بینی کے جلوؤں کے ساتھ حقیقت نگاری بھی نظر آتی ہے۔ آشا مکمل المیہ کردار ہے۔ معاشرہ غریب اور نیچ ذات کی لڑکی کا استعمال کرتا ہے۔ آخر کار اس کا انجام موت پر ہوتا ہے۔

عصمت کا ناول 'ٹیڑھی لکیر' (۱۹۴۰ء) میں لکھا گیا ہے یہ ناول عصمت کا اہم ناول ہے۔ شمن کا کردار اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ اردو ناول کے چند نا قابل فراموش کرداروں میں سے ایک کردار شمن کا ہے۔ عصمت نے ناول کی بنیاد نفسیاتی حقیقت پر رکھی ہے۔ عصمت کا یہ ناول پریم چند، سجاد ظہیر، کرشن چند اور عزیز احمد کی طرح آگے بڑھتی ہوئی زندگی اور نت نئی رائیں اختیار کئے ہوئے ہیں شمن اردو ناول کی پہلی ہیروئن ہے جو فکر و دانش کی یک آزاد کھلی فضا میں سانس لیتی ہے۔ وہ اپنے زہین سے سوچتی ہے۔ ناول میں ہیروین کی پیشکش کا نیا اسلوب ہے۔ شمن کے کردار میں المیہ عناصر کے فروغ میں اس کے ماحول کا بہت عمل دخل ہے۔

شمن ایک ایسے ماحول میں پروان چڑھتی ہے۔ جہاں پرانی اقدار کی نفی اور نئی اقدار کے فروغ میں اضافہ ہو رہا ہے بعض نقاد 'ٹیڑھی لکیر' کو (social psychologic) سماجی نفسیاتی ناول بھی کہتے ہیں۔ عصمت چغتائی کا شاہکار ناول 'ٹیڑھی لکیر' کا ہر کردار نفسیاتی الجھنوں کا شکار نظر آتا ہے ہر کردار نفسیاتی پیچیدگیوں اور جذباتی اتار چڑھاؤ

کی وجہ سے ٹریجڈی کا نمونہ قرار پاتا ہے۔ ہر کردار میں جذباتی تشنگی پائی جاتی ہے۔ ناول دراصل تین منزلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی منزل میں ہیروئن شمشاد کا بچپن ہے۔ جو بچپن میں مٹی کھاتی ہے اور بنائے بچے کے سانپ (سنپولیے) سانپ جنتی ہے۔ اس کی ولادت کا حال مصنفہ نے بڑے مزے سے بیان کیا ہے۔ بچپن کے مختلف ادوار کے حوالے سے دیکھا جائے تو لفظ (sex) جنس، جنسی اختلاط کے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا اس وقت اس کا مطلب اس کیفیت سے ہوتا ہے۔ جو بچے کے جسم کے مختلف حصوں کی برانگیختگی سے ہوتا ہے مثال کے طور بھوک لگنے پر بچہ ماں کے پستان یا بوتل کے نپل چوستا ہے۔ اس عمل میں اس کا دہن حرکت پذیر ہوتا ہے اور اس کے ذریعے اسے تسکین ملتی ہے۔ بول اور براز کی حالت ہونے پر انہیں خارج کرنے والے اعضا برانگیختہ ہوتے ہیں اور اخراج کے بعد کیف وسرور حاصل کرتے ہیں۔ یہ احساسات بھی اسی ذیل میں آتے ہیں آگے چل کر بچے کی سیرت بھی بچپن کے ابتدائی حصے کے ان ادوار سے متاثر ہوتی ہے۔ ان کے دوران پیدا ہونیوالی ضرورتیں ان کی تسکین یا عدم تسکین ان کی باہمی کشاکش، عدم تسکین کی صورت میں پیدا ہونے والا احساس نامراد (frustration) یہ سارے عوامل آگے جا کر شخصیت پر اثر ڈالتے ہیں۔ جس کی وجہ سے شخصیت غیر متوازن اور عدم احساس تسکین کا باعث بنتی ہے۔ شمن کے ساتھ بھی ایسے ہی عوامل اثر پذیر ہوئے۔ ناول میں دوسری منزل اور اس کے بعد کی منزلوں میں انہیں زندگی مزید تشنگی آمیز نظر آتی ہے۔ جوان ہونے پر کالج کی ایک سہیلی کے باپ رائے صاحب کی شخصیت اور مردانگی سے متاثر ہو کر شمن جب ان کو چاہنے لگتی ہے تو رائے صاحب سے شمن کا یہ لگاؤ بھی اس کی نفسیاتی اور جذباتی کجی کا مظہر ہے۔ ڈاکٹر صدیق جاوید اس کے بارے میں یوں لکھتے ہیں: ''دراصل بچاری ہیروئن ایک طرح (oedipus complex) کا شکار ہوگئی ہے۔''[۱۸]

اسے رائے صاحب کے چوڑے سینے میں مندر ناچتے نظر آتے ہیں۔ رائے صاحب شمن کو غیر معمولی توجہ دیتے ہیں تو شمن اس توجہ کو محبت سمجھ لیتے ہے اور خود ہی رائے صاحب سے محبت کا اظہار کر لیتی ہے شمن کا اظہار عشق دراصل نفسیاتی ٹیڑھے پن کی دلیل ہے۔ جو رائے صاحب کی محبت اور عام نوجوانوں کی محبت میں فرق نہیں کر پاتی۔ شمن کی زندگی چونکہ باپ کی ہے اور محبت سے بالکل عاری تھی یہ پیاس اس کے فطری تقاضوں کی ازلی پیاس روایتی بن کر اس کے لاشعور میں جا پہنچتی تھی۔ رائے صاحب سے محبت کی ایک وجہ (electro complex) بھی ہے۔ یہ وہ دور ہے جب اکثر لڑکیاں باپ کو خدا سے بزرگ و برتر سمجھ کر اسے اپنا آدرش قرار دیتی ہیں۔ رائے صاحب کے بعد شمن کی زندگی میں افتخار نامی مرد آتا ہے شمن سے وہ اس طرح اظہار محبت کرتا ہے کہ وہ اپنا دل دے دیتی ہے اور بعد میں وہ کئی بچوں کا باپ نکلتا ہے۔ اس سے شمن کا خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں اور محبت کی راہ میں وہ خود کو تھکن سے چور محسوس کرتی ہے۔ اور آخر کار بدلہ اور انتقامی کاروائی پر اتر آتی ہے شمن اپنی محبت کا بدلہ لوگوں سے جھوٹے اور مکار پریم سے لیتی ہے رفتہ رفتہ لوگ انھیں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور وہ تنہا رہ جاتی ہے۔ شمن کے نفسیاتی ٹیڑھے پن کا خلاصہ اس قدر ہے کہ وہ محبت کی بھوکی لڑکی ہے۔ ہر تجربہ اسے غم اور دھوکہ دیتا ہے جس کی وجہ سے اس

کی جذباتی زندگی متاثر ہوتی ہے۔ ضد اور بغاوت اس کی زندگی کے نمایاں پہلو ہیں شمن کے کردار کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ کردار شروع سے لیے کر آخر تک نفسیاتی اور جذباتی بیماریوں کے علاوہ المیہ کردار ہے ہر دور میں یہ کردار اذیت ناک حادثوں کا شکار رہے۔ 'ٹیڑھی لکیر' میں عصمت نے مسلم متوسط خاندانوں کی پردہ نشین لڑکیوں کی نفسیاتی پیچیدگیوں سے رونما ہونے والے مسائل کو ناول کا موضوع بنا کر معاشرت کی برائیوں کو گنوایا ہے۔ بقول ڈاکٹر شمع افروز زیدی:

> ''کہنے کو تو اس ناول کا اصل موضوع جنس ہے لیکن حقیقت میں اس کے پیش نظر ہمہ وقت ایک خاص مقصد رہتا ہے وہ ہے معاشرے کی اصلاح اور لڑکیوں کی تعلیم و تربیت لیکن اس کے لئے عصمت کے اسلوب میں واعظانہ یا فاصحانہ رنگ پیدا نہیں ہونے دیا۔''[۱۹]

شمن کا کردار اپنے اندر بے حد گہرائی رکھتا ہے۔ اس کے کردار کا موازنہ کرتے ہوئے ہمیں کہیں کہیں ہمدردی بھی ہوتی ہے۔ شمن دنیا سے مایوس ہے اپنے پرائے سب اس کو محبت سے عاری رکھتے ہیں۔ بچپن سے لے کر جوانی تک اس کے جذبات کو تسکین نہیں ملتی جس کی وجہ اس میں ضد اور ڈھٹائی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ جذباتی طور پر ابنارمل ہو جاتی ہے یہی چیز اس کو المیہ کی طرف لے جاتی ہے۔

''گریز'' عزیز احمد کا تیسرا ناول ہے اور یہ ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔ یہ نہ صرف مواد کے حوالے سے اہم ہے بلکہ تکنیک اور اسلوب کے لحاظ سے بھی ایک کامیاب ناول ہے۔ ''گریز'' میں عزیز احمد نے ایسے نوجوان کی کہانی پیش کی ہے۔ جو آئی سی ایس کے لئے منتخب ہوتا ہے اور تربیت کے لیے انگلستان اور یورپ کی سیر کرتا ہے۔

یہ وہ عہد ہے جب نوجوان کی ذہنیت یورپ جا کر تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہاں کا ماحول اور زمانے کی چال بڑے گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ ذہنی بے چینی کے علاوہ نفسیاتی اور جنسی انتشار کی عکاسی بھی کی ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ دور جدید میں محبت کے فرسودہ اور روایتی نظریوں اور قدروں میں تغیر پیدا ہو چکا ہے۔ اس لحاظ سے نعیم کا کردار پہلی جنگ عظیم کے بعد کی نسل کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ نسل جو ذہنی آسودگی روحانی سکون کھو چکی ہے اور خوف مرگ، جنسی ہیجان اور نفسیاتی کشمکش کا المیہ لئے ہوئے ہے۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید لکھتے ہیں:

> ''نعیم کا کردار زیادہ باشعور نہ سہی، لیکن خود نگر اور خود آگاہ ضرور ہے وہ جو اس میں جہاں کہاں جرات کی کمی اور اشخاص و واقعات سے گریز کا عمل ملتا ہے وہ اس کے اپنے پس منظر اور حالات کا بھی نتیجہ ہے۔ وہ ایک محکوم ملک کا نادر طالب علم ہے۔ جو صرف اپنے والدین کے سائے ہی سے محروم نہیں اپنے قریبی رشتہ داروں اور عزیزوں سے بھی محروم ہے..... داخلی خلفشار اور اپنے وجود کا کرب، ملکوں ملکوں پھرنے، طرح طرح کی تفریحات کرنے معاشقے کے باوجود کم نہیں ہوتا، گریز اس کی فطرت ہے، یہی اس ناول کا مرکزی خیال ہے۔ کس کو چاہے اور کس کو نہ چاہے اور کیا

نہ کرے، نعیم کے کردار کے اہم پہلو یہی ہیں۔''[۲۰]

نعیم کی ذہنی حالت خارجی اور داخلی زندگی کی نا آسودگی کا نتیجہ ہے۔ ناول میں مصنف نے نعیم کے کردار سے اپنے دور کی مکمل المیہ تصویر کھینچی ہے۔ قدروں کی شکست وزیر بحث دکھائی ہے۔ جنگ عظیم کے بعد تباہ حال یورپ کی منتشر زندگی کی تصویر کھینچی ہے۔ اس کے ساتھ سیاسی انتشار کے پس منظر کو ابھارا ہے۔ نعیم کی جنسی مریضانہ ذہنیت، جنسی، واقعات اور تعلقات میں اس طرح ہمارے سامنے آتے ہیں وہ سب اس دور کے سماجی اور انفرادی المیے ہیں۔ بقول محمد افضال بخت:

> ''نعیم الحسن ان حالات میں ہر طرح کی پاسداری سے انحراف کرتا ہے۔ اسے نہ ہی اخلاق کی پرواہ ہے اور نہ ہی مذہبی اقدار کی پاسداری ہوتی ہے۔ وہ ذہنی طور پر کشمش کا شکار نوجوان ہے اسے سائنس اور جدید علوم سے مکمل شناسائی ہے وہ اپنی زندگی سے مطمئن نہیں ہوتا، اس کی سوچ اور فکر کو مغربی تہذیب بھی متاثر نہ کر سکی وہ سماج اور تہذیبی اعتبار سے دوراہے پر کھڑا رہے۔''[۲۱]

''ایسی بلندی ایسی پستی'' عزیز احمد کا مقبول ناول ہے۔ اس ناول کا موضوع حیدرآباد کی اعلی سوسائٹی اور جاگیردارانہ طبقے کی عکاسی کرتا ہے۔ اس ناول میں جہاں انحطاط پذیر پر حیدرآبادی تہذیب کا المیہ پیش کیا گیا ہے۔ اسے اردو ناول نگاری میں تکنیک کے اعتبار سے ایک نیا تجربہ قرار دیا گیا ہے۔ اس ناول کو جہاں مصنف نے شجریاتی ناول کہا ہے وہاں نقاد اس کو اور نگاہ سے بھی دیکھتے ہیں۔ جیسے محمد حسن عسکری کہتے ہیں:

> ''عزیز احمد کی اس کتاب کو اجتماعی ناول کہا ہے۔ عزیز احمد نے شعوری طور پر براہ راست افراد کو نہیں لیا بلکہ ایک ہیت اجتماعی یا اس کے ایک حصے کو اپنا موضوع بنایا ہے چونکہ یہ ہیت اجتماعی ایک زوال پذیر قوت ہے۔ اس لئے اس میں ایک وحدت کی حیثیت سے عمل کرنے کی صلاحیت ضعیف رہ گئی ہے اس کی اجتماعی زندگی کو صرف افراد کے مطالعے کا ذریعہ ہی سمجھا جا سکتا ہے۔''[۲۲]

اس ناول میں مصنف نے تین طرح کے معاشرتی نظام کا احاطہ کیا ہے۔ ایک معاشرہ وہ ہے جو مقامی اور عوامی ہے۔ دوسرا معاشرہ انگریز صاحب بہادروں کی محبت کا پروردہ ہے، تیسرا معاشرہ آصف (مغلیہ دور) سے وابستہ ہے۔ ''ایسی بلندی ایسی پستی'' کی اشاعت نومبر ۱۹۴۷ء یعنی پاکستان بننے کے بعد ہوئی لیکن عزیز احمد اس ناول میں حیدرآبادی معاشرے کو موضوع بناتے ہیں جو بٹوارے کے المیے یا ہجرت اور فرقہ وارانہ فسادات سے بالکل الگ ہے۔ ''ایسی بلندی ایسی پستی'' دراصل ایک انحطاط پذیر معاشرے کی المیہ داستان ہے نور جہاں اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ نور جہاں نسوانی مرکزی کردار ہے۔ بسا اوقات خاموش رہتی ہے اور اسی وقت احتجاج اور ردعمل کا اظہار کرتی ہے جبکہ اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ نور جہاں نواب دی جاہ جنگ کی بیٹی ہے۔ نور جہاں کے علاوہ نواب صاحب کی چار بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے اس کی بیوی فوت ہو چکی ہے۔ ذی جاہ جنگ دوسری شادی ایک انگریز

عورت سے کر لیتا ہے جیسے سکندر زمانی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ سکندر زمانی کو خاندان اور وشوکت پر بڑا ناز ہے۔ نور جہاں کی شادی کو وہ خاندانی عزت وقار اور نام اونچا رکھنے کے لیے کشن پلی کے سلطان حسین سے کرتی ہے۔ سلطان حسین آزاد خیال اور شراب وشباب کا رسیا ہے۔ ناول کی ہیروئن نور جہاں ذہنی پاکیزگی اور محتاط روے کی علمبر دار ہے۔ نور جہاں اپنے شوہر کے رویے سے آپ ہی آپ گھلتی ہے۔ نور جہاں کی ازواجی زندگی میں تلخی ملتی ہے دنوں ایک دوسرے سے بے اعتمادی کا شکار ہیں اور آخر کار راستے جدا کر لیتے ہیں۔ دراصل نور جہاں کے المیے کے اصل وجہ اس کا ماحول اور معاشرہ ہے۔ نور جہاں اپنے دور کی ایک ایسی مثال ہے جو اپنی تمام تر برائیوں کے ساتھ انسانیت کی اقدار کا پاس اور مشرقی عورت پر رکھے ہوئے ہے۔ جبکہ سلطان حسین تمام برائیوں کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ ممتاز شیریں، نور جہاں کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''نور جہاں کچی مٹی ہے جس طرح ڈھالا جائے ڈھل جاتی ہے نور جہاں کی زندگی خام مواد ہے وہ ایک طرف وراثت اور دوسری طرف خارجی ماحول کے زیر اثر تشکیل پاتی ہے.....نور جہاں خود معصوم ہے۔ اس کا اپنا کوئی واقع کردار نہیں ہے۔ نور جہاں کی زندگی اس کے کردار سے بنتی ہے۔ جہاں سلطان حسین کے ساتھ ازواجی زندگی کے چھوٹے سے المیہ کی بھی وہ ذمہ دار نہیں ہے۔''[۲۳]

اسلم آزاد، ناول کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''بیشتر کردار قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول نہیں کرا پاتے لیکن نور جہاں کا کردار قاری کے ذہن کو متاثر کرتا ہے۔ اور اس سے ہمدردی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ جبکہ سلطان حسین کے کردار سے نفرت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ سر سے پاؤں تک گناہوں میں ڈوبا ہونے کے باوجود بلاوجہ نور جہاں کی پاکیزگی پر کیچڑ اچھالنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ دراصل یہ شخصی حکومت کے نظام کا آخری منظر نامہ ہے۔ کیونکہ اس کے بعد ہندوستان آزاد ہو گیا اور تمام جاگیر دارانہ اقدار جمہوریت کے نظام میں مدغم ہو گئیں اور اس نام نہاد سماج کی بھی موت واقع ہو گئی جو شکست کا پہلے ہی شکار ہو چکا تھا۔''[۲۴]

نور جہاں کو ناول میں مرکزی کردار کی حیثیت حاصل ہے اور ناول کی کہانی کے گرد گھومتی ہے۔ نور جہاں کے قصے سے ہی ناول آگے بڑھتا ہے اور اختتام پذیر ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا ناول نگاروں کے ناولوں کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ بیسویں صدی کے ساتھ ہی برصغیر میں نئی سوچ نے جنم لیا۔ صنعتی ترقی نے ساری دنیا کو لپیٹ میں لے لیا۔ لہٰذا اس کا اثر ناول پر بھی پڑا۔ صنعت وتجارت کے

مراکز قائم ہوئے تو اس کے ساتھ سمجھوتوں اور ترجیحوں کا ایک نیا فکری نظام قائم ہوا۔ دیہاتوں سے اٹھ کر لوگ شہروں میں آئے جس کی وجہ سے کاشتکاری کے پیشے کو زوال آیا اور جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی وجہ نئے نئے فکری نظریات سامنے آئے کارل مارکس کے مطابق: ناکام مقصد اپنے معاش اور معاشرتی ماحول کو پیدا کرتا ہے۔ فرائیڈ کے مطابق انسان ایک (phenomenon) حیاتیاتی تحصیات ہے۔ یہ سارے نظریات اور فلسفے انسانی فطرت کے حوالے نہیں تھے۔ جس کے وجہ سے انسانی وقار گر گیا۔ اس صورتحال نے انسان کے ناتشخص اور خودمختاری کو کافی ٹھیس پہنچائی۔ جس کی وجہ سے ایسی برائیاں کو پیدا کیا جس نے المیہ کو فروغ دیا۔

حواشی:

۱۔ قمر رئیس، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار، (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۲۰۰۴ء) ص ۴۰۹
۲۔ عبدالغفار، قاضی، لیلیٰ کے خطوط، مجنوں کی ڈائری (کراچی: پنجاب ہاوس، ۱۹۹۴ء) ص ۱۰۔۹
۳۔ ایضاً، ص ۲۷
۴۔ ایضاً، ص ۴۳
۵۔ ندوی، رشید اختر، ساز شکستہ، (لاہور: اردو بک سٹال، ۱۹۵۲ء) ص ۳۹
۶۔ سہیل بخاری، اردو ناول نگاری، (لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۶۰ء) ص ۳۰۲
۷۔ ندوی، رشید اختر، ساز شکستہ، ص ۱۹۵
۸۔ زاہد نوید، رشید اختر ندوی شخصیت اور فن (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان ۱۹۹۹ء) ص ۵۰
۹۔ سید علی حیدر، ڈاکٹر، اردو ناول سمت و رفتار، (الہٰ آباد: شبستان گنج، ۱۹۷۹ء) ص ۱۵۴
۱۰۔ ناصر، نصیر احمد، ادبی اسلوبیات، (دہلی: مکتبہ جدید، ۲۰۰۰ء) ص ۱۷
۱۱۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، (دہلی: آزاد کتاب گھر کلاں محل، س۔ن) ص ۱۷
۱۲۔ ایضاً، ص ۵۷
۱۳۔ مشتاق احمد دانی، ڈاکٹر، تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران، (دہلی: پبلشنگ ہاوس، ۲۰۰۲ء) ص ۱۹۲
۱۴۔ حسینی، علی عباس، ناول اور ناول نگار، (ملتان: کاروان ادب، ۱۹۹۰ء) ص ۲۳۴
۱۵۔ عبدالسلام، پروفیسر، اردو ناول بیسویں صدی میں، (کراچی: اردو اکیڈمی، ۱۹۷۳ء) ص ۲۹۲
۱۶۔ عصمت چغتائی، ضدی، (لاہور: مکتبہ شعر و ادب، ۱۹۴۱ء) ص ۱۰۴

۱۷۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول، (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۵ء) ص ۱۰۴

۱۸۔ صدیق جاوید، ڈاکٹر، کلیات نثر عزیز احمد، (لاہور: اردو اکیڈمی، ۲۰۰۸ء) ص ۲۸۸

۱۹۔ شمع افروز زیدی، ڈاکٹر، اردو ناول میں طنز و مزاح، (لاہور: پروگریسو بک ڈپو، ۱۹۸۸ء) ص ۲۲۷

۲۰۔ سلیمان اطہر جاوید، پروفیسر، عزیز احمد کی ناول نگاری، (دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاوس، ۱۹۸۷ء) ص ۳۰۔۲۹

۲۱۔ افضال بخت، ڈاکٹر، اردو ناول میں سماجی شعور (اسلام آباد: پورب اکیڈمی، ۲۰۰۹ء) ص ۱۳۰

۲۲۔ حسن عسکری، محمد، انسان اور آدمی، (کراچی: سات رنگ، س۔ن) ص ۲۲۹

۲۳۔ ممتاز شیریں، معیار، (لاہور: نیا ادارہ، ۱۹۶۲ء) ص ۱۸۳

۲۴۔ اسلم آزاد، ڈاکٹر، عزیز احمد بطور ناول نگار، (دہلی: ایجوکیشن پبلشنگ ہاوس، ۲۰۰۸ء) ص ۱۳۱